حرف آغاز

جہاد کے احکام[1]

(جنگی تیاری کی نوعیت)

سید جلال الدین عمری

اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کے لیے ممکنہ تیاری کی ہدایت کی ہے۔ اسلامی ریاست اس کی پابند ہوگی، لیکن اُسے عام طور پر اس طرح کا حکم نہیں سمجھا جاتا جس طرح دنیا کی حکومتیں اپنی ضروریات اور مصالح کے تحت فوجی تیاری کرتی ہیں۔ اس کے لیے قوانین اور ضوابط وضع کرتی اور احکام نافذ کرتی ہیں، بلکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک جنگجو ریاست ہے اور اپنی مہم جوئی کے لیے تیاری کرتی ہے۔ اس کی یہ تیاری امنِ عالم کے لیے خطرہ ہے۔ وہ جنگی لحاظ سے مسلح ہوگی تو دوسرے ملکوں پر یورش کر بیٹھے گی اور کسی اصول، قاعدے اور ضابطے کی پابند نہ ہوگی۔ گویا وہ ایک بے رحم اور اندھی بہری طاقت ہوگی جو دوسروں کو روندتی اور پامال کرتی چلی جائے گی۔ اِسی وجہ سے اسلامی ریاست کا تصور ہی آج کے ذہن کے لیے انتہائی ہولناک ہے۔ اور اس کی فوجی تیاری کے ذکر سے خوف اور خطرے کا ماحول پیدا ہوجاتا یا دانستہ پیدا کردیا جاتا ہے۔ یہ دراصل جہاد کی تیاری اور اس کی غرض وغایت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہاں اس سے متعلق احکام

---

[1] سلسلے کے لیے ملاحظہ ہو سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ۔ اپریل۔ جون ۲۰۰۳ء

اور پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ اس تیاری کی نوعیت کیا ہے اور اس کا جواز ہے یا نہیں؟

ساتویں صدی عیسوی میں رسول اللہ ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو اہلِ عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا جس کی پورے قبیلے پر حکم رانی ہوتی۔ افراد قبیلہ حق اور ناحق اور صحیح وغلط ہر معاملہ میں اس کی ہم نوائی کرتے اور اس کا ساتھ دیتے۔ قبائلی عصبیت وحمیت رگ وپے میں اتری ہوئی تھی۔ اس کی خاطر وہ آسانی سے جان کی بازی تک لگا سکتے تھے۔ بعض قبائل کے درمیان خونی رشتے اور سماجی ومعاشی تعلقات بھی تھے، لیکن زیادہ تر وہ خانہ جنگی اور باہمی تصادم کے شکار تھے۔ قتل وخوں ریزی عام تھی۔ لوٹ مار اور شب خون کا بازار گرم رہتا۔ قبیلے سے باہر کے کسی شخص کی جان، مال اور عزت وآبرو محفوظ نہ تھی۔ صحرائے عرب میں تنہا سفر کرنا دشوار تھا۔ قافلوں کی شکل میں سفر ہوتا اور قافلے بھی بسا اوقات لُٹ جاتے۔ صحرا کی زندگی اور گردو پیش کے حالات نے ہر شخص کو فوجی یا سپاہی بنادیا تھا۔ وہ اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے ہروقت تیار رہتا اور جب چاہتا اپنی حربی صلاحیت کو دوسرے کے خلاف استعمال بھی کرتا۔ اسلام نے ان مختلف قبائل کو ایک امت بنایا اور قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کی صورت میں ایک مکمل آئین اور قانون دیا، قبائلی اقتدار کو ختم کرکے باضابطہ ریاست قائم کی، اس کے متحارب قبائل کو ایک نظم کے تحت مجتمع کیا اور جنگ جو افراد کو ایک باقاعدہ ریاست کے شہری کی حیثیت عطا کی اور انہیں آئین وقانون کا پابند بنایا، حالتِ جنگ اور حالتِ امن دونوں میں اخلاق اور قانون کی بالادستی قائم کی۔ جنگ کو کسی بھی فرد کی آزاد مرضی پر نہیں چھوڑا کہ جب چاہے جنگ کا سائرن بجادے اور جنگ شروع کردے بلکہ اسے ریاست کے دائرۂ اختیار میں رکھا۔ اس کی تیاری کے معلوم ومعروف ذرائع تجویز کیے اور اس کا مقصد واضح کیا۔

جنگ دوطرح کی ہوتی ہے۔ ایک دفاعی اور دوسری اقدامی۔ دونوں کے لیے مناسب تیاری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسلام نے ریاست کو عسکری لحاظ سے مضبوط ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس کے لیے فرد اور ریاست کا مال خرچ کرنا اور اپنے وسائل کا استعمال کرنا اس کے نزدیک بڑے اجرو ثواب کا باعث ہے۔ ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (الانفال: ٦٠)

اور تیار رکھو ان کے لیے جس حد تک تم سے ہوسکے (فوجی) قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے، جس سے اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن پر خوف طاری رہے۔ ان کے علاوہ ان لوگوں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے۔ اور اللہ جانتا ہے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کروگے وہ تمہیں پورا دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔

آیت کا آغاز وَاَعِدُّوْا لَهُمْ، (ان کے لیے تیار رکھو) کے الفاظ سے ہوا ہے 'اعدوا' کا مصدر 'اعداد' ہے۔ اس کے معنی بغوی اور خازن نے لکھے ہیں: 'اتخاذ الشیٔ لوقت الحاجة،[1] (کسی چیز کو ضرورت کے وقت کے لیے رکھنا) گویا اس میں ضرورت اور حاجت کا تصور ہے۔ یعنی یہ تیاری ضرورت کے تحت ہوگی اور ضرورت ہی کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

---

[1] بغوی، معالم التنزیل، خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۳/۵۷
دارالکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۵ء

آیت میں جنگ کی تیاری کے ذیل میں 'قوۃ' اور 'رباط الخیل' کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنیؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اور تین مرتبہ ارشاد فرمایا:

ألاان القوة الرمی۔[1] سن لو قوت تیر اندازی ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دورِ رسالت کے طریقۂ جنگ میں تیراندازی یا ناوک فگنی کی خاص اہمیت تھی۔ اس میں آدمی دشمن کو قریب آنے سے روک سکتا اور ایک خاص فاصلے سے اُسے نشانہ بنا سکتا ہے۔ بعض اور حدیثوں میں بھی ناوک فگنی کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح اس فن کے سیکھنے کے بعد اُسے بھول جانے یا اُسے حقیر سمجھ کر نظر انداز کرنے کی مذمت کی گئی ہے اور اسے سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من علم الرمی ثم ترکہ فلیس منا أو قد عصی،[2] جس کسی نے تیراندازی سیکھی اور پھر اُسے ترک کر دیا تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا یہ فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ کی حدیث کے ذیل میں امام نووی فرماتے ہیں: یہ اور اس مضمون کی دوسری احادیث سے تیر اندازی، اس کے مقابلے اور اس کے اہتمام کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کی نیت سے ہو۔ یہی حکم دلیری اور شجاعت کے مظاہرے، ہتھیار کے مختلف استعمالات کی مشق اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے کا ہے۔ ان سب کا مقصد جنگ کی تربیت اور اس میں مہارت پیدا کرنا اور جسم کو مضبوط بنانا ہے۔[3]

---

[1] مسلم: کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی والحث علیہ و ذم من علمہ ثم نسیہ

[2] مسلم: حوالہ سابق

[3] نووی: شرح مسلم، ج ۷، جزء ۱۳، ص ۵۶، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۵ء

قرآن مجید نے جنگی تیاری کے سلسلے میں ''قوۃ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دورِ اوّل میں اس قوت کا بڑا ذریعہ تیر اندازی تھا اس لیے اس کی خاص ترغیب دی گئی، لیکن ہر دور کی مناسبت سے جنگی قوت مختلف ہوسکتی ہے۔ اِسی وجہ سے مفسرین نے اسے عام رکھا ہے۔ زمخشری نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

کل مایُتَقوّیٰ به فی الحرب من عددها [1]

وہ ساری چیزیں جن سے جنگ میں قوت حاصل کی جاتی ہے اس کے سامان میں شمار ہوں گی۔

یہی بات بیضاوی نے اِن الفاظ میں کہی ہے:

من کل مایُتَقَوّیٰ به فی الحرب [2]

(قوت سے مراد ہے) ہر وہ چیز جس سے جنگ میں تقویت حاصل کی جائے۔

امام رازی کہتے ہیں قوت سے بہت سی چیزیں مراد لی گئی ہیں، لیکن ان میں بہتر قول، جیسا کہ اصحابِ معانی نے کہا ہے، یہ ہے کہ یہ ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن سے جنگ میں تقویت حاصل کی جاتی ہے۔ 'قوت' کے لفظ میں تمام آلاتِ حرب شامل ہیں۔ [3]

آیت میں جنگی تیاری کے ذیل میں 'رباط الخیل' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ رباط الخیل کے معنی ہیں گھوڑوں کا فوجی مقاصد کے لیے تیار کرنا، احادیث میں ان کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے۔

---

1. زمخشری: الکشاف ۲/
2. بیضاوی: انوار التنزیل ولباب التاویل ۱/۳۸۹، دارالکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۸۸ء
3. رازی: التفسیر الکبیر ج ۸، جزء ۱۵، ص ۱۴۸، درالکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۰ء، نیز ملاحظہ ہو خازن: لباب التاویل ۳۰/ ۵۸

میدانِ جنگ میں گھوڑوں کی بڑی اہمیت رہی ہے، پیادہ فوج کے مقابلے میں وہ زیادہ بہتر خدمت انجام دیتے ہیں۔

آج کے دور میں اس تیاری میں باقاعدہ تربیت یافتہ فوج، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں، ہیلی کاپٹر، جنگی طیارے اور دورِ جدید کے تمام اسلحے اور سازوسامانِ حرب آجائیں گے۔ آئندہ ان سے بھی زیادہ ترقی یافتہ اسلحہ اس میں شامل ہوسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے جنگی تیاری کے ذیل میں 'مَااسْتَطَعْتُمْ' کہا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ تیاری جس حد تک تم سے ہوسکے ہونی چاہیے۔ کسی ریاست کے لیے فوجی تیاری کس حد ممکن ہے اس کا فیصلہ، اس کی ضروریات، اس کی معیشت، علم وتحقیق، فنی واقفیت اور ملکی اور بین الاقوامی حالات کے پیش نظر ہوگا۔

اس تیاری کا مقصد ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ، مطلب یہ کہ یہ تیاری اس لیے ہونی چاہیے کہ جو اللہ کے دشمن ہیں اور جن کی تمہارے ساتھ بھی دشمنی ہے ان کو خوف دلاسکو۔ ان پر تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔ اس کے ساتھ فرمایا:

'وَ آخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَاتَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، یعنی بعض تو تمہارے کھلے دشمن ہیں، انہیں تم پہچانتے ہو، لیکن وہ دشمن بھی ہیں، جن کی دشمنی سے تم ناواقف ہو۔ کسی بھی وقت وہ تمہیں نقصان پہنچاسکتے ہیں۔ اس جنگی تیاری کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھی تمہارے خلاف اقدام کرنے کی ہمت نہ کریں۔ گویا یہ جنگی تیاری ریاست کے کھلے یا چھپے دشمنوں کے خلاف ہے۔ یہ اُن لوگوں کے خلاف نہیں ہے جو ریاست کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ دراصل دوسروں پر حملہ یا اُن سے جنگ کا حکم نہیں ہے، بلکہ یہ جنگ بازوں کو جنگ سے روکنے کی تدبیر ہے۔ دنیا کا ہر ملک چاہتا ہے کہ اس کے پاس اتنی طاقت ہو کہ کوئی ملک اس پر حملہ آور نہ ہوسکے۔ اسلام نے

بھی اس کی ہدایت کی ہے۔

قرآن مجید نے جنگ کے سلسلے میں مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ پوری طرح محتاط، چوکس اور مسلح رہیں۔ سورۂ نساء میں احکام جہاد کا بیان اس طرح شروع ہوتا ہے۔

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُوْا	اے ایمان والواپنی احتیاط رکھو
خُـذُوْا حِـذْرَكُـمْ فَانْفِرُوْا	اور بھر ٹکڑیوں کی شکل میں یاایک
ثُبَـاتاً اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعاً...	ساتھ (جہاد کے لیے) نکلو۔

(النساء:۷۱)

آیت کے الفاظ ہیں 'خـذوا حذركم'۔ حِذر یا حَذر کے معنی ہیں بچنا اور احتیاط کرنا۔ یہ کسی خوف ناک یا نقصان دہ چیز سے ہوتا ہے۔ امام راغب 'حذر' کے معنی بتاتے ہیں 'احتـراز عن مخيف' (کسی خوف ناک چیز سے بچنا) اسی سے آلات جنگ کے لیے بھی حذر کہا جانے لگا۔ اس لیے کہ یہ دشمن سے حفاظت اور اس کے حملوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ 'خُـــذُوْا حِذْرَكُمْ' کے معنی امام راغب نے بیان کیے ہیں:

مـافيه الحذر من السلاح وغيره[۱] (وہ چیز جس میں احتیاط اور بچاؤ ہے جیسے ہتھیار وغیرہ)

زمخشری کہتے ہیں حَذر اور حِذر کے معنی ایک ہیں۔ اَخذ حذرہ، کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ بیدار ہوگیا اور خطرناک چیز سے بچ گیا۔ گویا احتیاط اور بچاؤ کو اس نے اپنے جسم وجان کی حفاظت کے لیے آلہ بنالیا۔[۲]

پوری احتیاط اور جنگی تیاری کی ہدایت کے ساتھ چھوٹی ٹکڑیوں یا بڑے لشکر کی شکل میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔

---

۱ راغب: المفردات فی غریب القرآن، مادہ حذر، ص ۱۱۸، دارالمعرفۃ، بیروت ۱۹۹۸ء

۲ زمخشری: الکشاف عن حقائق التنزیل، ۱/۵۲۱، دارالکتب العلمیہ، لبنان، ۱۹۹۵ء

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم دے رہا ہے کہ وہ دشمن سے محتاط رہیں۔ اس سے لازم آتا ہے کہ وہ مقابلے کے لیے اسلحہ، ساز و سامان اور فوج کی تعداد میں اضافہ کے ذریعہ تیار رہیں۔ اللہ کے راستہ میں نکلنے کے لیے نفیر (جنگ کے لئے نکلنے کا حکم) سے فوج میں اضافہ ہوگا۔[1]

مسلمان جن حالات سے گزر رہے تھے ان میں اس احتیاط اور تیاری کی سخت ضرورت تھی۔ عرب کے مختلف قبائل اسلام اور اسلامی ریاست سے برسر پیکار تھے۔ ان کے مقابلہ کے لیے کبھی چھوٹے چھوٹے فوجی دستے بھیجنے پڑتے اور کبھی بڑی فوج تشکیل دینی ہوتی۔ ان حالات کا مخلص و جاں باز اور سرفروش مسلمان جی جان سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ان کا سابقہ باہر کے دشمنوں کے علاوہ منافقین سے بھی تھا، جو مارِ آستین بنے ہوئے تھے، جو دل سے مسلمانوں کو ناکام دیکھنا چاہتے تھے۔ خود پست ہمتی کا مظاہرہ کرتے اور طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر دوسروں کی ہمت بھی پست کرنے کی کوشش کرتے۔ قرآن مجید نے اسی سلسلۂ بیان میں ان پر تنقید کی اور رسول اللہ ﷺ سے خطاب فرمایا:

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ○
(النساء:۸۴)

پس تم اللہ کے راستے میں قتال کرو۔ تم صرف اپنی ذات کے ذمے دار ہو۔ مومنوں کو (جنگ کی) ترغیب دو۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ، ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ہے جنگ سے روک دے۔ اللہ جنگ میں زیادہ شدید ہے اور زیادہ سخت سزا دینے والا ہے۔

---

[1] ابن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۱/۵۲۴، دار المعرفۃ، بیروت ۱۹۶۹ء

مطلب یہ کہ اے اللہ کے رسول جب اللہ کے راستے میں جنگ کا موقع آئے۔ آپ آگے بڑھیے، اس کی پروانہ کیجیے کہ کوئی ساتھ دے رہا ہے یا نہیں دے رہا ہے۔ آپ صرف اپنی ذات کے ذمہ دار ہیں۔ اہلِ ایمان کو اس میں شرکت کی ترغیب دیجیے، وہ منافقین کی طرح پیچھے نہیں رہیں گے، بلکہ ان کی رفاقت آپ کو حاصل ہوگی۔

جہاد کے اس حکم کے ساتھ یہ بھی بتادیا گیا کہ ضروری نہیں کہ آپ کو جنگ لازما کرنی ہی پڑے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ ایسے حالات پیدا ہوسکتے ہیں کہ دشمن کے جنگی عزائم بدل جائیں اور وہ اپنے مذموم ارادوں سے باز آجائے اور آپ کو جنگ سے سابقہ نہ پیش آئے۔ لیکن اگر جنگ مسلط ہوتو آپ کو پوری قوت سے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ دشمن کی طاقت سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں، اس کی جتنی طاقت ہے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ طاقت ور ہے۔

یہ درحقیقت احتیاطی تدبیر اور خود حفاظتی کی کوشش ہے۔

سرحد کی حفاظت

اسلامی ریاست کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ داخلی اور خارجی حملوں سے حفاظت کا نظم کرے۔ اسے ہمارے علما نے مسلمانوں کے امام یا سربراہ ریاست کے فرائض میں شمار کیا ہے۔ اِسی میں سرحدوں کی حفاظت آتی ہے۔ قرآن مجید کی ہدایت ہے:

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَّاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (التوبۃ:۱۲۳)

اے ایمان والو! جنگ کرو ان اہل کفر سے جو تم سے قریب ہیں۔ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے (اس لیے اس سے ڈرتے رہو)

آیت کے الفاظ عام ہیں، لیکن اِس سے سرحدوں کی حفاظت کے سلسلے میں بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ کوئی غیر مسلم ریاست اسلامی ریاست کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنائے یا اُس پر حملہ آور ہوتو اسلامی ریاست پوری قوت سے اس کا مقابلہ کرے گی۔ یہ اپنے دفاع کے لیے اس کی جنگ ہوگی اور اس کے لیے تیاری کو دفاعی تیاری کہا جائے گا۔

قرآن مجید میں جنگ کی تیاری کے ذیل میں 'رباط' اور 'مرابطہ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان الفاظ کے معنی ہیں، جنگی مقاصد کے لیے گھوڑوں کو تیار کرنا۔ ان میں دوطرفہ عمل اور مسابقت کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے یہ الفاظ سرحد کی حفاظت کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ سرحد پر دونوں طرف فوج تیار ہوتی ہے اور دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔[1]

جنگی تیاری کے سلسلے میں سورۂ انفال کی آیت (۶۰) کا حوالہ گزر چکا ہے۔ **وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم** الآیۃ اس میں رباط الخیل کا حکم ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران: ۲۲۰)	اے ایمان والو! صبر کرواور مقابلہ میں ثابت قدم رہو اور جڑے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ امید ہے تم فلاح پاؤ گے۔

علامہ زمخشری نے رابطوا، کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

أقيموا في الثغور رابطين خيلكم فيها مترصدين مستعدين بالغزو[2]	سرحدوں پر قیام کرو، وہاں اپنے گھوڑوں کو تیار رکھو، گھات لگائے بیٹھو اور جنگ کے لیے تیار رہو۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح: ۷/ ۲۵۷ دارالفکر، بیروت ۱۹۹۴ء

[2] زمخشری، الکشاف: ۱/ ۴۴۹

احادیث میں اس 'رباط' کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد سنا ہے:

رباط یوم ولیلة خیر من صیام شهر وقیامه وان مات جری علیه عمله الذی کان یعمله واجری علیه رزقه وأمن الفتان[1]	سرحد پر ایک دن اور رات کا قیام ایک مہینہ کے روزوں اور اس کی راتوں کے قیام سے بہتر ہے۔ اگر اس کی موت واقع ہوجائے تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کرتا رہا ہے، اس پر اس کا رزق جاری رہے گا اور وہ (قبر کے) فتنہ سے مامون رہے گا۔

ایک اور حدیث حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کل میت یُختم علی عمله الا الذی مات مرابطاً فی سبیل الله فانه ینمی له عمله الی یوم القیامة ویأمن فتنة القبر۔[2]	ہر میت کا عمل ختم کردیا جاتا ہے سوائے اس شخص کے جو اللہ کے راستے میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے۔ اس کا عمل روز قیامت تک بڑھتا رہتا ہے اور وہ قبر کے فتنے سے محفوظ رہتا ہے۔

علامہ ابن الہمام کہتے ہیں کہ جہاد کے ذیل میں 'رباط' بھی ہے۔ یہ ایسی جگہ قیام کو کہا جاتا ہے جہاں سے دشمن کے حملے کا امکان ہے۔ یہ قیام اللہ کی رضا کی خاطر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد علامہ ابن الہمام نے ان

---

[1] مسلم: کتاب الامارة، باب فضل الرباط فی سبیل اللہ عز وجل

[2] مشکوۃ: کتاب الجہاد بحوالہ ترمذی و ابوداؤد

احادیث کا ذکر کیا ہے جو رباط کی فضیلت کے سلسلے میں مروی ہیں۔ [۱]

افرادی طاقت

جنگی تیاری کے سلسلے میں قرآن نے اسلحہ اور فوجی سازو سامان کا جہاں ذکر کیا ہے وہیں افرادی طاقت Man power کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں افراد خود ہی جنگی تیاری کرتے تھے۔ دشمن کے مقابلے اور اپنی دفاع کے لیے ہروقت مسلح رہتے تھے۔ قرآن نے ان کی تیاری کا رخ موڑ دیا اور انہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رہنے اور جب اس کا موقع ہوتو تنگی، ترشی، سختی، آسانی، سہولت اور عدم سہولت ہر حال میں نکل پڑنے کا حکم دیا:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (التوبۃ:۴۱)

نکل پڑو، (سازو سامان کے لحاظ سے) خواہ ہلکے ہوں یا بوجھل۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر تم اسے جان لو۔ [۲]

کم زور ایمان والے اور منافقین اس معاملے میں پس وپیش کرتے تھے۔ انہیں سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی کہ اگر تم اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے تیار نہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ دوسروں سے یہ خدمت لے گا اور تم اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ فرمایا:

---

[۱] ابن الہمام: فتح القدیر ۵/۴۱۹

[۲] خفافاً و ثقالاً کے بہت سے مفہوم بیان ہوئے ہیں۔ امام رازی اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں کہ جہاد کے لیے نکل پڑو چاہے تمہارے لیے آسان ہو یا مشکل۔ رازی: ج۸، جزء۱۶، ص ۵۶، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۰ء

يَـآ اَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا مَالَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُـمْ بِالْحَيٰوةِ الـدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَـمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (التوبۃ: ۳۸،۳۹)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے اللہ کے راستے میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو زمین سے چپکے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی سے خوش ہو حالاں کہ دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت کے مقابلے میں بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلوگے تو اللہ تمھیں دردناک عذاب دے گا اور تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا اور تم اللہ کا کچھ بگاڑ نہ سکوگے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ان کی غفلت اور کاہلی پر اس طرح تنقید کی گئی۔

وَلَـوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَـهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْـلَ اقْـعُـدُوْا مَـعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ (التوبہ:۴۶)

اگر وہ جہاد کے لیے نکلنا چاہتے تو اس کے لیے سامان تیار کرتے، لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا اور کہا گیا کہ بیٹھے رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔

جنگ کے لیے افرادی طاقت کتنی ہو اس کا فیصلہ حالات کے مطابق ہوگا۔ اس معاملے میں اسلام نے اصولی ہدایت یہ دی ہے کہ افرادی قوت میں فریقین کے درمیان ایک حد تک توازن ضروری ہے۔ غیر معمولی عدم توازن ہو تو کامیابی کی توقع مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جب مسلمان تعداد میں بہت تھوڑے تھے لیکن ان کے اندر ایمانی جوش و جذبہ، صبر

وثبات اور استقامت کی کیفیت بہت زیادہ تھی، تو حکم تھا کہ تمہارا حریف اگر دس گناہ بھی ہے تو حوصلہ اور ہمت نہ ہارو۔ صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝

(الأنفال: ۶۴۔۶۵)

اے نبی! اللہ تمہارے لئے کافی ہے اور جو اہل ایمان تمہاری اتباع کر رہے ہیں (وہ کافی ہیں) اے نبی اہل ایمان کو جنگ کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر (ایسے) سو ہوں گے تو ہزار اہل کفر پر غالب آئیں گے۔ اس لئے کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے (کہ اللہ کی راہ میں جان دینا کتنی بڑی سعادت ہے)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اہل ایمان کے اندر صبر و ثبات ہو تو وہ اپنے سے دس گنا طاقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ بیس ہوں تو دو سو پر اور سو ہوں تو ہزار پر غلبہ پا سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں دس گنا طاقت سے بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ لیکن یہ حکم خاص حالات میں تھا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل کے حملوں کو روکنے کے لیے مختلف اطراف و جوانب میں چھوٹے چھوٹے سرایا بھیجنے پڑتے تھے اور بعض اوقات بڑی قبائلی طاقت کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔[1] لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اہل ایمان کو اتنے سخت امتحان میں نہیں ڈالا گیا۔ اس حکم میں تخفیف کر دی گئی

---

[1] رازی: ج ۸، جزء ۱۵، ص ۱۵۴

اور یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال: ٦٦)

اب اللہ نے اس معاملہ میں تم پر تخفیف کر دی ہے اور یہ جان لیا ہے کہ تمہارے اندر ضعف اور کم زوری ہے لہذا اگر تم میں سے سو، ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں (ایسے) ہزار ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ میدان جنگ میں استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا جائے اور اس بات کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے کہ آدمی مقابلے سے پیچھے ہٹے اور دشمن کو پیٹھ دکھائے؟ سوائے اس کے کہ جنگی حکمت عملی اس کا تقاضا کر رہی ہو۔ ارشاد ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (الانفال: ۱۵۔۱۶)

اے ایمان والو! جب فوج کشی کے موقع پر تمہارا ان لوگوں سے سامنا ہو جنہوں نے کفر کیا ہے تو انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ، جس کسی نے اس دن انہیں اپنی پیٹھ دکھائی، سوائے اس کے کہ وہ جنگ کی کوئی تدبیر کرنا چاہے یا اپنی فوج کے کسی حصہ کی طرف آنا چاہے، تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

حدیث میں میدان جنگ سے فرار کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اجتنبوا السبع الموبقات (سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو) ان میں سے ایک گناہ آپ نے یہ بتایا، والتولی یوم الزحف (جنگ کے روز پیٹھ پھیرنا)[1]

سورۂ انفال کی آیت ۶۱ اوپر گزر چکی ہے۔ اس میں بشارت دی گئی ہے کہ دشمن کی تعداد دوچند ہو تو بھی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو غلبہ عطا کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخالف فوج دگنی ہو تو بھی مسلمانوں کو ہمت نہیں ہارنی چاہئے اور پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دوگنی سے زیادہ فوج سے مقابلہ ہو تو کیا اسلامی فوج کا پسپائی اختیار کرنا غلط اور گناہ کا باعث ہوگا؟ علماء نے اس کے قانونی اور اخلاقی پہلو سے بحث کی ہے۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا ہے کہ اہل ایمان جنگ میں پشت نہ دکھائیں۔ یہ حکم اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ حریف کی تعداد دگنی سے زیادہ نہ ہو۔ اس صورت میں اہل ایمان کے لیے فرض ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار نہ اختیار کریں لیکن اگر فریق مخالف تعداد میں دوگنے سے زیادہ ہو تو پسپائی اختیار کرنا جرم نہ ہوگا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص دو کے مقابلے میں بھاگ کھڑا ہو تو اس نے فرار کی راہ اختیار کی۔ اگر وہ تین سے فرار اختیار کرتا ہے تو اسے فرار نہیں کہا جائے گا۔ مطلب یہ کہ وہ فرار کی وعید کا مستحق نہیں ہوگا۔

بعض حضرات نے اس معاملے میں تعداد ہی کا نہیں ضعف وقوت، اسلحہ، سامان جنگ اور مہارت کو بھی پیش نظر رکھا ہے اس لحاظ سے سو گھڑسوار کا فریق مخالف کے سو گھڑ سوار سے پیچھے ہٹ جانا جائز ہوگا۔ اگر وہ ان

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح: کتاب الایمان، باب الکبائر وعلامات النفاق

پہلوؤں سے دگنی سے زیادہ طاقت رکھتا ہو۔ لیکن جمہور کی رائے یہی ہے کہ فوج سے فرار کا جواز اسی وقت ہے جب کہ اس کی تعداد دگنی سے زیادہ ہو ورنہ نہیں۔ بڑی سے بڑی فوج کے مقابلے میں ثابت قدمی بہرحال پسندیدہ ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے سے دوچند اور سہ چند فوج کا مقابلہ کیا ہے۔ [1]

علامہ بغوی اکثر اہل علم کی رائے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

أن المسلمين اذا كانوا على الشطر من عدوهم لايجوز لهم أن يفروا و يولوا ظهورهم الا متحرفا لقتال او متحيزا الى فئة و ان كانوا اقل من ذلك جاز لهم ان يولوا ظهورهم و ينحازوا عنهم [2]

اگر مسلمان اپنے دشمن سے نصف تعداد میں ہوں تو فرار اختیار کرنا اور اسے پیٹھ دکھانا جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی جنگی چال ہو یا اپنے کسی فوجی دستے میں شامل ہونا پیش نظر ہو تو اس کی اجازت ہے۔ اگر وہ نصف سے کم ہوں تو ان کے لئے پیٹھ دکھانا اور ان سے دور نکل جانا جائز ہوگا۔

یہ ایک قانونی بحث ہے کہ لڑائی کے میدان سے پسپائی اختیار کی جاسکتی ہے یا نہیں اور اس کا جواز ہے تو کن حالات میں ہے؟ جنگ میں اس کی بھی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ یہ جذبہ جہاد کے منافی نہیں ہے۔ مومن

---

[1] قرطبی الجامع لاحکام القرآن: ج۴، جزء ۷، ص ۲۴۱، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۸ء

[2] بغوی: معالم التنزیل، نیز ملاحظہ خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل: ۳/۲۱، اس موضوع پر مزید بحث کے لئے رجوع کیا جائے۔ ابن قدامہ المغنی: ۱۳/۱۸۶ اور اس سے آگے

میدان کارزار میں جان ہتھیلی پر لے کر جاتا ہے اور شہادت کو عین سعادت تصور کرتا ہے۔ اس کا کرّ و فر اور اس کا آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا سب کچھ حکمت عملی کے تحت ہوگا۔ بزدلی کا پہلو اس میں نہ ہوگا۔ اس کا ایمان و یقین اور اس کا جذبۂ صادق ہی اس کا اصل سرمایہ ہے۔ اس سے وہ بڑی سے بڑی حریف طاقت پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور حاصل کرتا رہا ہے۔ یہی حقیقت قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (البقرۃ: ۲۴۹)

بارہا ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب ہوئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن نے جنگ کی تیاری کی جو ہدایات دی ہیں اور احادیث میں ان کی جو تفصیلات آئی ہیں انہیں یہاں پیش کیا گیا ہے۔ جنگ کی تیاری کس نوعیت کی ہو؟ اس کا تعلق زمان و مکان اور حالات سے ہے۔ البتہ ریاست کا تحفظ ضروری ہے۔ اس کے لیے وہ لازمی اقدامات کرے گی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عسکریت پسندی اور دہشت گردی ہے۔ کیا یہ نوع انسانی کے خلاف کوئی خفیہ منصوبہ اور سازش ہے؟ اگر اسلامی ریاست پر یہ الزام عائد ہوسکتا ہے تو دنیا کی کوئی بھی ریاست اس سے بری نہیں قرار دی جاسکتی۔ ● ● ●

غیر اسلامی ریاست اور مسلمان از: مولانا سید جلال الدین عمری

کسی غیر اسلامی ریاست میں مسلم اقلیت کا کیا موقف ہونا چاہیے اور اسلام نے اس سلسلے میں کیا ہدایات دی ہیں؟ یہ دور حاضر کا ایک اہم سوال ہے۔ نام ور عالم دین مولانا سید جلال الدین عمری نے اس کتاب میں اس کا مدلل جواب فراہم کیا ہے اور دین پر استقامت، عدل کا قیام، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، انسانی حقوق کا احترام، دفاع اور انتقام کا حق اور اس کی معنویت اور مطلوبہ دینی واخلاقی کردار جیسے عنوانات پر عالمانہ بحث کی ہے اور ان اعتراضات کا باوقار جواب دیا ہے جو اس موضوع پر کیے جاتے ہیں۔

مولانا کی یہ کتاب اس موضوع پر ایک رہ نما کتاب بھی ہے اور اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی۔ سائز: ۳۶×۲۳ صفحات: ۴۸ قیمت: ۱۵/- روپے

ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵